⊙ گوہر امین

پی ایچ ڈی اسکالر، لاہور کالج برائے خواتین یونیورسٹی، لاہور

انجمن ترقی پسند مصنفین: تاریخ کے آئینے میں

Abstract:

Progressive Writers Association is the Prominent Literary Movement of 20th. Centaury, Started in 1936 by the group of anti-imperialist & left oriented Writers who wants to change through their writings advocating equality among all humans and attacking social injustice and backwardness in the society. This is the only literary movement in the sub continent who take the initiate to produce the literature for the people of grass route level and raise the vice against the imperialism for their economic justice in their writings. In Urdu Literature this is the strongest movement after Sir Syed education movement, the progressive writers contributed to Urdu literature a lot of finest pieces of fiction and poetry. Undoubtedly, Progressive Writers Movement is the trend setter for the upcoming generation of writers to change the society through the literature. This article is research base discovery and critical analyses of the Progressive Writers Association history where tried to express the main point that why the existence of progressive writers movement needed for our society.

Keywords:

Progressive, Writers, Movement, Imperialism, Literature, 1936

برصغیر جس کا موجودہ نام جنوبی ایشیا ہے جو انڈین پلیٹ کے براعظم ایشیا کی پلیٹ سے ٹکرانے کے سبب ہمالیہ کے پہاڑوں کے جنوب مشرقی اور جنوب مغربی خطے کی صورت میں ایشیا کا حصہ بنا جسے ہمالیہ کا پیالہ بھی کہا جا سکتا ہے۔ ایک دور تھا کہ یہ صرف اور صرف جنگلات کی وادی تھی جہاں انسان نہیں بستے تھے تاریخ کے کسی موڑ پر جزائر انڈونیشیا سے بہت

سے قبیلوں نے خوراک کی تلاش میں اس جانب کا رُخ کیا، برما اور آسام کے راستے جنوبی ایشیا میں داخل ہوئے جہاں انہوں نے جنگلات صاف کیے اور کھیتی باڑی کا عمل شروع کیا ان قبائل میں دراوڑ کول اور بنگا اہم قبائل تھے۔ واضح رہے کہ بنگا قبیلے کے نام پر ہی شمال مشرقی برصغیر کے علاقے کا نام بنگال ہے۔ دراوڑ پورے برصغیر میں پھیل گئے آج برصغیر میں یہی قبائل یہاں کے حقیقی وارثوں کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس کے بعد جنوبی ایشیا میں شمال اور شمال مغرب کی جانب سے مسلسل حملہ آور آتے رہے۔ جن میں ہُن، منگول وسطی ایشیا کے گواجر قبیلے، افغانی، ایرانی، یونانی اور عرب شامل ہیں۔ وسطی ایشیائی قبائل کو آریاؤں کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے جنہوں نے ڈھائی سے تین ہزار قبل مسیح میں جنوبی ایشیا کے پورے علاقے پر قبضہ کر لیا اور دراوڑی نسل کے قبائل کو جنوب کی طرف دھکیل دیا یہی وجہ ہے کہ آج بھی جنوبی ہندوستان کی پانچ اہم ریاستوں کی آبادی کی اکثریت دراوڑ نسل سے تعلق رکھتی ہے۔ سولہویں صدی تک برصغیر کے سماج پر حملہ آوروں کی تشکیل دی ہوئی تہذیب وثقافت مذہبی رسم ورواج، معاشی اصول وضوابط اور طریقہ پیداوار کے ساتھ ساتھ اُن کا ترتیب دیا ہوا سیاسی اور سماجی نظام قائم تھا۔ یہ ایک ٹھہرا ہوا سماج تھا جس میں تبدیلی کا عمل برائے نام تھا۔ سترھویں صدی میں جب یورپی اقوام نے برصغیر کا رُخ کیا اور آہستہ آہستہ یہاں کے سماج پر قبضہ کرنا شروع کیا تو پرانی معاشرتی قدریں پیداواری ڈھانچے اور طرزِ حکمرانی میں تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں۔

۱۷۵۷ء میں انگریزوں اور سراج الدولہ کے درمیان لڑی جانے والی جنگ پلاسی میں انگریزوں کو مکمل فتح ہوئی تو انگریزوں کی یہ فتح تبدیلی کا پہلا سنگ میل ثابت ہوئی اور پورے سماج میں معاشی سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کا عمل تیز سے تیز تر ہوتا چلا گیا۔ ان تبدیلیوں نے نہ صرف برصغیر کو پہلی دفعہ ایک ملک کی شکل دی بلکہ چھ سو سے زائد مقامی ریاستوں اور راجواڑوں کو اپنا باجگزار بنالیا اگلے سو سال یعنی ۱۸۵۷ء تک وہ ہندی معاشرے کی رگ رگ پر قبضہ کر چکے تھے اور جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں فتح حاصل کر کے انگریزوں نے پورے برصغیر کو برطانوی تاج کا حصہ بنالیا تھا اور برصغیر مکمل نوآبادی کی شکل اختیار کر چکا تھا۔ برصغیر کی معیشت جو ہزار ہا سال سے خود کفالت کی بنیاد پر قائم تھی اور زرعی پیداوار کے ساتھ ساتھ ہنرمند کاریگروں کی تیار کردہ مصنوعات برآمد کرنے والی ایک بڑی منڈی تھی آہستہ آہستہ برطانوی استعمار کی مصنوعات کی درآمدی منڈی میں منقلب ہو چکی تھی۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد جب جنوبی ایشیا ایک باضابطہ نوآبادی بن گیا تو یورپی طرز کے ریاستی ادارے تشکیل پانا شروع ہو گئے۔ روایتی قاضیوں کی جگہ انگریزی عدالتوں نے لے لی۔ پانچ ہزاری اور دس ہزاری صوبے داروں کی فوج ختم ہو کر برطانوی ریاست کی ریگولر فوج کا ادارہ قائم ہو گیا۔ انگریزی طرز کے قوانین تشکیل دیئے جانے لگے۔ جدید طرز کے تعلیمی ادارے وجود میں آئے اور جاگیریں بادشاہ کی ملکیت سے نکل کر انگریزوں کے حمایتی سرداروں، خانوں، وڈیروں اور نوابوں کی مستقل ملکیت بن گئیں۔ انگریزوں کے حمایتی اشرافیہ اور مڈل کلاس پر مشتمل نئے طبقات وجود میں آئے۔ صنعتی مزدوروں کی ایک بڑی افلاس زدہ فوج پیدا ہوئی ان سب حالات واقعات نے پورے سماج کی اُتھل پُتھل کر دی۔

''انگریزوں سے قبل آنے والے حملہ آوروں کے دور میں سماجی اور تہذیبی زندگی میں کوئی قابل

ذکر تبدیلی تو نہ آئی ہر آنے والی حملہ آور نسل مقامی تہذیب اور سماج میں ضم ہو کر رہ گئی۔ البتہ لوگ اپنے مذہب پر قائم رہے اور حملہ آوروں کے مذاہب سماجی رنگ میں رنگ گئے۔ سماج کی درجہ بندی اور طبقات میں کوئی ایسی بڑی تبدیلی نہ آئی جسے ہم خصوصی تبدیلی کا نام دے سکیں جس کے سبب یہاں کا رہن سہن، معاشی ڈھانچہ، سیاسی طور طریقے، رسم و رواج اور شعر و ادب بھی ٹھہراؤ کا شکار تھے۔ نچلے طبقوں کا لوک ادب ان کے غم اور خوشیوں کا داخلی اظہار تھا اور بالا دست طبقے مذہبی ڈراموں شاعری اور داستانوں کے اسیر تھے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تصوف پر مبنی شاعری کے ڈھیر لگ رہے تھے اور دربار کے ارد گرد گھٹیا عشقیہ شاعری ہو رہی تھی جس میں انسانوں کی باہمی صورت حال کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ جنگی نغمے بھی مذہبی جنونیت کا اظہار تھے یہ تھا وہ ادب و فن جو پورے برصغیر میں تخلیق کیا جا رہا تھا۔"(۱)

۱۸۵۷ء کے بعد تشکیل پانے والے نئے سیاسی، سماجی اور معاشی اداروں نے برصغیر کی تہذیب و ثقافت پر انتہائی گہرے اثرات مرتب کئے جس کے نتیجے میں مقامی باشندوں کو نئے دور کی تہذیب اور ایجادات سے آگاہی تو حاصل ہوئی لیکن ان کی معیشت کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا اور اس کے ساتھ ہی ان کے ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ کی کایا کلپ بھی کر دی۔ نوآبادیاتی نظام نے نہ صرف معاشی استحصال کو تیز تر کر دیا بلکہ سیاسی اور ثقافتی استحصال کی بھی حد کر دی جس کے نتیجے میں حکومت اور لوگوں کے درمیان اور فرد اور فرد کے درمیان نئی نوعیت کی مغائرت پیدا ہوئی۔ جس نے سماجی ہیجان انگیزی کو ہر جانب فروغ دیا۔ یوں برصغیر کے عوام اپنی ہزاروں سال کی مقامی دانش سے محروم ہوتے چلے گئے اور جدید عہد کی دانش جو اگرچہ بڑے کام کی چیز تھی لیکن ان کے لئے غربت افلاس اور بے چینی کا سبب ہونے کی بناء پر ناپسندیدہ اور نفرت انگیز تھی ان حالات میں برصغیر کے مضطرب باشندوں میں نئی سیاسی، سماجی، فکری اور ادبی تحریکوں نے جنم لینا شروع کیا۔ ان تحریکوں کا نصب العین برصغیر کے تاریخی ورثے، دانش، سماجی قدروں کا احیاء اور غیر ملکی آقاؤں سے آزادی حاصل کرنا تھا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک برطانوی نوآبادیاتی نظام حکومت اپنی تشکیل مکمل کر چکا تھا۔ الٰہ آباد، کلکتہ، بمبئی، مدراس (چنائے) اور نئی دہلی کی صورت میں یورپی طرز کے شہر قائم ہو چکے تھے۔ جہاں ابتدائی نوعیت کی صنعتیں بھی قائم کر دی گئیں تھیں اور پورے برصغیر میں ریل اور ڈاک کے مربوط نظام کے ساتھ ساتھ بے شمار مقامات پر انگریز فوجی چھاؤنیاں قائم ہو چکی تھیں دوسری طرف آزادی کی تحریکیں بھی منظّم ہونا شروع ہو گئیں تھیں۔ ۱۸۵۸ء میں برصغیر کی پہلی سیاسی جماعت کانگرس کے نام سے وجود میں آ چکی تھی اور مسلم کمیونٹی بھی چھوٹی چھوٹی تنظیموں کی صورت میں اپنی صف بندی شروع کر چکی تھی جو ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کی صورت میں باقاعدہ ایک سیاسی جماعت کی شکل میں سامنے آ گئی۔ سیاسی تحریکوں کے ساتھ ساتھ فکری تحریکوں کا ایک ریلا بھی چل پڑا تھا اس ریلے نے ایک طرف تو انگریزوں کے قائم کردہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں جو کہ انہوں نے اپنے لئے حکومتی کارندے پیدا کرنے کے لئے قائم کئے تھے کے بطن سے جنم لیا، انگریزوں نے پروپیگنڈے کے لئے اخبارات اور رسائل و جرائد کا جال بھی پھیلایا اس کے ردّعمل میں مقامی لوگوں نے بھی اپنے اخبارات اور رسائل و جرائد کی بنیاد رکھی جن میں سماجی صورت حال کے تجزیے پر مبنی خبریں، مضامین اور ادب شائع ہونے لگا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے نتیجے میں سب سے زیادہ نقصان مسلم کمیونٹی کو پہنچا۔ صرف یوپی کا ہی جائزہ لیا جائے تو اس کے ریاستی مشینری میں مسلمان سرکاری ملازموں کی شرح ۸۳ فیصد تھی جو کہ جنگ کے دس سال بعد ۲۹ فیصد رہ گئی تھی جس نے مسلم اشرافیہ اور مڈل کلاس کو قلاش کر دیا تھا، اس ماحول میں سرسید احمد خاں وہ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے مریض کی علامات دیکھ کر مرض کی شناخت کی اور تعلیمی، سیاسی اور سماجی سطح پر ایک نئی فکری تحریک کو جنم دیا۔ جس کے خدوخال انہوں نے یورپ کے دریافت کردہ جدید سائنسی اصولوں پر استوار کئے اور قوم کو نئے عہد کی ترجیحات کو اپنانے کی دعوت دی۔ یوں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں جدید عہد کی طرز زندگی کی بنیادیں استوار کرنے کے کام کی ابتدا کی۔ سرسید احمد خاں اس لحاظ سے برصغیر میں ترقی پسندی کے پہلے معمار کی حیثیت سے اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ اُن کی تحریک کے بہت سے کمزور پہلو بھی تھے۔ جیسے انگریز حکومت کا ساتھ دینا اور انگریز استعمار سے صلح جوئی سے کام لینے کا مشورہ دینا شامل ہے، لیکن مجموعی طور پر انہوں نے علی گڑھ سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ کالج، مذہبی تعلیم کی فطری بنیادوں پر تشریح اور نئے تہذیبی رویوں اور اخلاقیات کو اپنانے کی طرح ڈالی۔ جس کے نتیجے میں اُنہیں قدامت پسندوں کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سے قبل ہمیں ادب میں اگرچہ غالب کے ہاں ترقی پسندی اور جدیدیت کے بہت سے مظاہر نظر آتے ہیں لیکن یہ کوئی باقاعدہ تحریک نہیں تھی۔ جبکہ سرسید نے شعوری طور پر شب و روز کی محنت سے جدت پسندی اور ترقی پسندی کی راہ کو اپنایا تھا اور عوام میں اس حوالے سے شعور بیدار کرنے کی گرانقدر خدمات سرانجام دیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے برصغیر کے معاشرے کا نیا سفر شروع ہوتا ہے۔

اس وقت تک ہندوستان کے اندرونی منظرنامے کے ساتھ ساتھ ہم بیرونی دنیا پر نظر ڈالیں تو یورپ کی ترقی یافتہ اقوام نے برصغیر کے علاوہ پورے ایشیاء، افریقہ اور لاطینی امریکہ کو بھی اپنی نوآبادیات میں تبدیل کر لیا ہوا تھا۔ ان تینوں براعظموں کے وسائل اور باشندوں کی محنت لوٹ کر یورپ میں اکٹھا کر رہے تھے یورپ صنعتی مصنوعات کی پیداوار میں نہ صرف خود کفیل ہو چکا تھا بلکہ اپنی ضرورت سے زیادہ مصنوعات پیدا کر کے نوآبادیاتی منڈیوں میں دھڑا دھڑ فروخت کر رہا تھا اور اپنے کارخانوں کو چالو رکھنے کے لئے اپنی نوآبادیات کے قدرتی وسائل اور خام مال کے جہازوں کے جہاز بھر کر یورپ کے کارخانوں میں پہنچا رہا تھا۔ اس ساری صورت حال میں جرمنی اور اٹلی دو ایسے ترقی یافتہ ملک تھے جہاں ہر میدان میں ترقی تو ہو رہی تھی لیکن اُن کے پاس کوئی نوآبادی نہیں تھی۔ یہ دونوں ممالک خصوصی طور پر جرمنی دیگر استعماری ممالک سے منڈیاں ہتھیانے کی کوششوں میں مصروف تھے اور آپس میں باہم دست و گریباں تھے۔ اس کے ساتھ ہی یورپ ترقی تو کر رہا تھا اور دنیا بھر سے دولت اپنے ہاں اکٹھی کر رہا تھا لیکن یہ دولت جس کا بڑا حصہ سرمائے میں بدل دیا گیا تھا صرف یورپ کی اشرافیہ کی خوشحالی کا سبب بن رہا تھا۔ وہاں کے نچلے طبقے نوآبادیات سے آنے والی لوٹ گھسوٹ کی آمدن اور مقامی صنعتوں کی پیداوار سے حاصل ہونے والی آمدنی میں اپنا حصہ حاصل کرنے سے محروم تھے۔ لہٰذا پورے یورپ میں سرمایہ دارانہ ترقی کے نتیجے میں استحصال کی رفتار میں تیزی آ جانے کے سبب شدید بے چینی کا شکار تھے اور اس کے نتیجے میں پورے یورپ بشمول امریکہ میں نچلے طبقے کی سیاسی سماجی اور معاشی تحریکوں میں تیزی آ گئی تھی اور انہوں نے اپنے ہاں اشرافیہ طبقے کے خلاف مضبوط تحریکوں کو جنم دیا جس سے یورپ کے بالادست طبقے انتہائی خوف زدہ تھے۔ ایسی ہی استحصال

دشمن تحریکیں نیم ترقی یافتہ روس میں بڑی تیزی سے پروان چڑھ رہی تھیں اور ایک مرحلے پر یہ تحریکیں اتنی مضبوط ہو گئیں کہ انہوں نے بالشویک پارٹی کے پرچم تلے اکٹھے ہو کر ۱۹۰۵ء میں انقلاب برپا کر دیا اگرچہ یہ انقلاب ناکام رہا لیکن پورے یورپ کی استحصال دشمن تحریکوں میں اعتماد بڑھ گیا کہ وہ مزید مضبوط ہو کر اگر بالا دست طبقوں پر حملہ آور ہوں تو وہ ریاستوں پر قبضہ کر سکتی ہیں۔ اسی عرصے میں جرمنی میں فاشزم نے خود کو مضبوط کر کے دیگر یورپی اقوام پر حملہ کر دیا اور پہلی جنگ عظیم کی ابتدا ہو گئی جو ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۷ء تک جاری رہی اس جنگ میں کروڑوں یورپی باشندوں کے ساتھ ساتھ نو آبادیات کے عوام بھی جنگ کی بھینٹ چڑھے یہ جنگ اگرچہ جرمنی ہار گیا لیکن اس جنگ کے بطن سے روسی انقلاب نے جنم لیا اور سترہ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو روس میں زارِ روس کا تختہ الٹ کر لینن کی قیادت میں بالشویک پارٹی ریاست پر قابض ہو گئی جس نے روس کا نیا نام یو ایس ایس آر رکھا اور ایسی اصلاحات نافذ کیں کہ روسی عوام کی قسمت بدلنا شروع ہو گئی، روسی انقلاب نے ایک طرف یورپی سرمایہ داروں کو خوفزدہ کیا تو دوسری طرف یورپی محنت کشوں کی تحریکوں کے ساتھ ساتھ نو آبادیاتی ممالک میں چلنے والی آزادی کی تحریکوں کو بے پناہ تقویت بخشی۔ خود یورپ کے مفکر، فلسفہ دان، ماہرین سماجیات اور ادیبوں کو انسانوں کی آزادی کی جنگ تیز کرنے کے شاندار مواقع میسر آ گئے اور انہوں نے فکری تحریکوں کو مہمیز دی۔ اس صورت حال میں دنیا بھر کے ادیبوں اور دانشوروں نے خود کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنا شروع کیا اور دنیا بھر کے انسانوں کی آزادی کی جدوجہد کو اپنی تحریروں، افسانوں، ناولوں اور شاعری کے ذریعے تقویت پہنچانے کے لئے فرانس میں ۱۹۳۵ء میں ادیبوں شاعروں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس کا انعقاد کیا۔

جولائی ۱۹۳۵ء میں دنیا بھر سے تحریر و تقریر کی آزادی کے متوالے جو اپنے ادب و فن کے ذریعے دنیا کو تبدیل کرنے آزادی کے جذبوں سے لبریز اور طبقاتی سماج کے خاتمے کی خاطر فنون لطیفہ کو ایک اوزار بنانے کے خواہاں تھے ایسے ادیبوں شاعروں اور دانشوروں کی ایک کانفرنس پیرس میں منعقد کی گئی اس کانفرنس کے بنیادی مقاصد کانفرنس کے اعلامیے میں ان الفاظ میں درج کئے گئے ہیں۔

> ''رفیقانِ قلم! موت کے خلاف زندگی کی ہم نوائی کیجیے ہمارا قلم، ہمارا فن، ہمارا علم ان طاقتوں کے خلاف رکنے نہ پائے جو موت کو دعوت دیتی ہیں، جو انسانیت کا گلا گھونٹتی ہیں جو سرمائے کے بل بوتے پر حکومت کرتی ہیں، جو کارخانہ داروں اور زبردستوں کی آمریت قائم کرتی ہیں اور بالآخر فاشزم کے مختلف روپ دھار کر سامنے آتی ہیں اور یہی وہ طاقتیں ہیں جو معصوم انسانوں کا خون چوستی ہیں۔'' (۲)

پیرس کانفرنس میں دو ہندوستانی ادیبوں جو اُس وقت برطانیہ میں زیر تعلیم تھے پیرس پہنچ کر اس کانفرنس میں شرکت کی، یہ دو ادیب ملک راج آنند اور سجاد ظہیر تھے۔ دونوں ادیبوں نے پیرس کانفرنس سے ہمت حاصل کی اور تازہ دم حوصلوں، نئے جذبوں اور شعور کی بالیدگی کے ساتھ واپس لندن پہنچے تو اُن کے دماغوں نے برصغیر کے روشن خیال لکھاریوں کی ایک تنظیم کا ارادہ باندھ لیا۔ ۱۹۳۵ء کی شام کو لندن کے نانکنگ ہوٹل میں انہوں نے چند ادیبوں کا ایک اجلاس منعقد کر کے انڈین پروگریسو رائٹرز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھ کر اس کا منشور تحریر کیا۔ اس منشور کو تحریر کرنے والوں میں ڈاکٹر جوتی

گھوش، ملک راج آنند، پروسین گپتا، ڈاکٹر محمد دین تاثیر، ڈاکٹر کے ایس بھٹ، ڈاکٹر ایس سنہا اور سجاد ظہیر شامل تھے۔ اسی نشست میں سجاد ظہیر کو اس تنظیم کا عبوری سیکرٹری جنرل نامزد کیا گیا۔ ان افراد کا تحریر کردہ منشور درج ذیل ہے:

> ''ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جا رہی ہیں اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے ہندوستانی ادیبوں کا فرض ہے کہ وہ ہندوستانی زندگی میں ہونے والے تغیرات کو الفاظ اور ہیئت کا لباس دیں اور ملک کو تعمیر و ترقی کے راستے پر لگانے میں ممد و معاون ہوں۔ ہندوستانی ادب قدیم تہذیب کی تباہی کے بعد زندگی کی حقیقتوں سے بھاگ کر رہبانیت اور بھگتی کی پناہ میں جا چھپا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے روح اور بے اثر ہو گیا ہے ہیئت میں بھی اور معنی میں بھی، اور آج ہمارے ادب میں بھگتی اور ترک دنیا کی بھرمار ہو گئی ہے جذبات کی نمائش عام ہے عقل و فکر کو یکسر نظر انداز بلکہ رد کر دیا گیا۔ پچھلی دو صدیوں میں بیشتر اس طرح کے ادب کی تخلیق عمل میں آئی ہے۔ جو ہماری تاریخ کا انحطاطی دور ہے۔ اس انجمن کا مقصد یہ ہے کہ اپنے ادب اور دوسرے فنون کو پجاریوں اور پنڈتوں اور دوسرے قدامت پرستوں کے اجارے سے نکال کر انہیں عوام سے قریب تر لایا جائے۔ انہیں زندگی اور واقعیت کا آئینہ دار بنایا جائے جس سے ہم اپنا مستقبل روشن کر سکیں، ہم ہندوستان کی تہذیبی روایات کا تحفظ کرتے ہوئے اپنے ملک کے انحطاطی پہلوؤں پر بڑی بے رحمی سے تبصرہ کریں گے اور تخلیقی و تنقیدی انداز سے ان سبھی باتوں کی مصوری کریں گے جن سے ہم اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے نئے ادب کو ہماری موجودہ زندگی کی بنیادی حقیقتوں کا احترام کرنا چاہیے اور وہ ہے ہماری روٹی کا، بدحالی کا، ہماری سماجی پستی کا اور سیاسی غلامی کا سوال۔ ہم اسی وقت ان مسائل کو سمجھ سکیں گے اور ہم میں انقلابی روح بیدار ہو گی۔ وہ سب کچھ جو ہمیں انتشار، نفاق اور اندھی تقلید کی طرف لے جاتا ہے۔ قدامت پسندی ہے، اور وہ سب کچھ جو ہم میں تنقیدی صلاحیت پیدا کرتا ہے اسی کو ہم ترقی پسندی کہتے ہیں۔''(۳)

بعد ازاں اس منشور کی کاپیاں تیار کی گئیں جو امرتسر میں محمود الظفر وائس پرنسپل ایم اے او کالج، کلکتہ میں بیرن مکرجی، حیدرآباد دکن میں ڈاکٹر یوسف حسن خاں بمبئی میں ہیتھی سنگھ اور الٰہ آباد میں پروفیسر احمد علی کو ارسال کی گئیں۔

برصغیر میں سرسید کی تحریک میں الطاف حسین حالؔی نے ان کے کندھے سے کندھا ملا کر حصہ لیا۔ بعد ازاں انہوں نے لاہور آ کر مولانا محمد حسین آزاد کے ساتھ مل کر انجمن پنجاب تشکیل دے کر جدید ادب کی بنیاد رکھی، انجمن پنجاب کے زیر اثر لکھا جانے والا ادب اس لحاظ سے ترقی پسند تھا کہ اس میں نئے موضوعات کے ساتھ ساتھ سماجی صورت حال کا واضح اظہار بھی موجود ہوتا تھا۔ لیکن اس ادب میں انسانی آزادیوں اور کچلے ہوئے انسانوں کے دکھوں اور مسائل کا ذکر نہیں ملتا تھا۔ تاہم آزادی کی تحریکوں کے سبب بہت سارے شاعروں اور ادیبوں میں انفرادی سطح پر نئے دور کے انسانوں کے مسائل کا شعور پیدا ہوا۔ جو اپنی اپنی تحریروں میں نئی فکر کا واضح اظہار کر رہے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں جوش ملیح آبادی کا پہلا شعری

مجموعہ شائع ہوا تو اس میں آزادی فکر کا واضح اظہار موجود تھا دوسری طرف منشی پریم چند نے اپنے افسانوں میں انسان اور سماج کے مسائل اور دکھوں کو اپنا موضوع بنایا۔ اسی طرح ۱۹۳۲ء میں مختلف افسانہ نگاروں کے افسانوں کا مجموعہ ''انگارے'' کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ یہ کتاب سامراجیت کے خلاف انسان اور معاشرے کے استحصال سے آزادی کی برصغیر میں پہلی مربوط آواز تھی، جس کی گونج پورے ہندوستان میں سنائی دی، اس آواز سے خوفزدہ ہو کر انگریز نواز اخبار اسٹیٹ مین نے انگارے کے خلاف مضامین شائع کئے اور مولانا ماجد دریا آبادی نے انگارے کے خلاف زبردست تحریک چلائی جس کی آڑ میں انگریز حکومت نے دسمبر ۱۹۳۳ء میں کتاب انگارے پر پابندی لگا کر اُسے ضبط کر لیا۔

دسمبر ۱۹۳۵ء میں سجاد ظہیر لندن سے واپس ہندوستان آ گئے اور ہندوستان پہنچتے ہی انہوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سازی کا کام شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا کہ پورے ہندوستان میں آزادی کے حوالے سے سیاسی سرگرمیاں انتہائی عروج پر تھیں، بقول سجاد ظہیر:

> ''۱۹۳۰ء کے بعد چند سال میں سوشلزم کا نظریہ درمیانہ طبقے کے دانشوروں میں عام طور سے پھیل گیا تھا۔''(۴)

اس وقت کی سیاسی و سماجی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے سجاد ظہیر لکھتے ہیں:

> ''گذشتہ تاریخ اور اسلاف کے کارناموں اور اپنے تہذیبی ورثے سے ہمیں ضرور سبق لینا چاہیے اور ان کا پہلا سبق یہ ہے کہ قدیم اور گزرے ہوئے معاشی، سیاسی اور تہذیبی دور کو زندہ نہیں کیا جا سکتا البتہ علم، فن، ہنر، آرٹ، ادب اور اخلاق کے وہ خزانے جو گزشتہ دور میں ہمارے اسلاف نے اپنی جسمانی، ذہنی اور روحانی کاوش سے جمع کئے ہیں اور ہمارا موجودہ تمدن جن کا نتیجہ ہے وہ ہمارا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے۔ اس سرمایہ کی حفاظت اور اس کا دانش مندانہ استعمال ترقی پسندی کا لازمی عنصر ہے، تہذیب کی یہ اقدار ہمیں اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو سمجھنے اور اسے خوشگوار اور بہتر بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ ان کے ہی وسیلے سے ہم اپنی موجودہ حیات اور عہد حاضر کے تقاضوں کو پورا کر کے نئی تہذیب کی تخلیق کر سکتے ہیں۔''(۵)

سجاد ظہیر نے لندن سے آتے ہی سب سے پہلے الٰہ آباد میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی تنظیم سازی کی۔ اور ہفتہ وار اجلاس منعقد کروانے شروع کیے جن میں افسانہ نظم یا مضمون پڑھا جاتا اور حاضرین تحریر کا تنقیدی جائزہ لیتے۔ ایک طرف تو الٰہ آباد میں انجمن کے اجلاس منعقد ہونا شروع ہو گئے تھے اور دوسری طرف پورے ہندوستان کے لکھاریوں کو تنظیم سے وابستہ کرنے کے لئے سرگرمیوں کا آغاز کر دیا گیا۔ لندن میں تیار کردہ منشور سجاد ظہیر پہلے ہی لندن سے ہندوستان کے مختلف علاقوں کے نامور اور معتبر ادیبوں، شاعروں کو ارسال کر چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں صرف دو اڑھائی مہینے کے عرصے میں ہی ہندوستان کے مختلف شہروں میں انجمن کی سرگرمیوں سے دانشوروں کے بڑے حلقے میں ترقی پسند ادب کی تحریک سے وابستگی اور دلچسپی بڑھنے لگی تھی لہٰذا سجاد ظہیر نے پورے برصغیر کا دورہ کرنا شروع کیا۔ وہ بنگال گئے حیدر آباد کے ادیبوں سے رابطہ کیا، پنجاب پختون خواہ اور دیگر علاقوں کا دورہ کیا اور کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام کے لئے پہلے

تاسیسی اجلاس جسے انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل ہند کانفرنس کا نام دیا گیا کے بارے میں صلاح مشورے اور تیاریاں شروع کر دیں۔کل ہند کانفرنس کے انعقاد کے لئے جن باتوں کو سب سے زیادہ اہمیت دی گئی ان میں سے ایک نکتہ تو یہ تھا کہ کانفرنس میں ان تمام یا ان میں زیادہ سے زیادہ زبانوں کے جدید ادب اور ادبی مسائل پر مقالے پڑھے جانے چاہیں جو ہندوستان میں بولی جاتی ہیں۔

> ''کانفرنس کے ذریعے سے ملک کی مختلف زبانوں کے ادیبوں کو ایک دوسرے کے ادب سے تھوڑی بہت بھی واقفیت اور دلچسپی ہو جائے، اگر ہم یہی جان لیں کہ اس ملک کی بڑی بڑی زبانوں میں اس وقت کون سے ادبی مسائل درپیش ہیں اور ادبی دھاروں کا رخ کیا ہے تو یہ ایک بڑے اچھے کام کی ابتدا ہوگی۔اور اس سے ہماری تحریک کو مجموعی طور سے فائدہ پہنچے گا۔''(۶)

دوسرا نکتہ جو زیر بحث تھا وہ یہ کہ انجمن کے دستور کا خاکہ تیار کیا جائے تا کہ کل ہند مرکزی تنظیم قائم ہو سکے اور علاقائی اور مقامی انجمنوں کے باہمی تعلقات اور انجمن کی ممبر سازی کی شرائط کا تعین کیا جا سکے۔ایک اور اہم نکتہ انجمن کا بیرونی ادبی اداروں سے تعلق یا الحاق کے لئے منصوبہ سازی کرنا تھا۔کیونکہ اس کے ذریعے ادیبوں کے اتحاد کو تقویت دیئے جانے کے ساتھ ساتھ ان کے جمہوری حقوق کا تحفظ بھی کیا جا سکتا تھا۔

کانفرنس کے انعقاد کی ابتدائی تیاریاں الٰہ آباد میں ہی شروع کر دی گئیں تھیں اس سلسلے میں صدارت کے لئے کئی نام زیر بحث آئے جن میں مسٹر کنہیا لال منشی، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت جواہر لال نہرو اور منشی پریم چند اہم نام تھے۔ لیکن حتمی قرعہ منشی پریم چند کے نام کا نکلا، منشی پریم چند بنارس میں رہتے تھے اور سجاد ظہیر الٰہ آباد میں، لہٰذا ان سے صدارت کے سلسلے میں خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ابتداء میں منشی پریم چند نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔لیکن ایک دو خطوں کے بعد وہ بالآخر کانفرنس کی صدارت کرنے پر راضی ہو گئے اور منشی جی نے ۱۹ مارچ ۱۹۳۶ء کو اپنے ایک خط میں سجاد ظہیر کو لکھا:

> ''اگر ہمارے لئے کوئی لائق صدر نہیں مل رہا تو مجھی کو رکھ لیجئے۔مشکل یہی ہے کہ مجھے پوری تقریر لکھنا پڑے گی.....میری تقریر میں آپ کن مسائل پر بحث چاہتے ہیں۔اس کا کچھ اشارہ کیجئے۔ میں تو ڈرتا ہوں میری تقریر ضرورت سے زیادہ دل شکن نہ ہو۔آج ہی لکھ دو تا کہ وردہ جانے سے قبل اسے تیار کر لوں۔''(۷)

کانفرنس منعقد کرنے کی تاریخیں دس، گیارہ اپریل ۱۹۳۶ء طے کی گئیں اور الٰہ آباد سے سجاد ظہیر، ڈاکٹر رشید جہاں، محمود الظفر لکھنؤ آ گئے۔لکھنؤ میں اس وقت تک انجمن ترقی پسند مصنفین کی کوئی مقامی شاخ نہیں تھی۔لکھنؤ میں سوائے سجاد ظہیر کے ذاتی دوستوں، رشتہ داروں یا دو تین یونیورسٹی طلباء کے علاوہ کوئی مددگار نہیں تھا، فنڈز کے حوالے سے بھی مالی حالت انتہائی پتلی تھی۔اور صرف سوا سو روپے موجود تھے۔دفتر کے لئے بھی کوئی جگہ نہیں تھی۔لکھنؤ میں سجاد ظہیر کے والد کا ایک مکان وزیر منزل تھا۔ان کے والد ریٹائرمنٹ کے بعد واپس اپنے آبائی شہر الٰہ آباد منتقل ہو چکے تھے اور وزیر منزل اکثر و بیشتر خالی پڑا رہتا تھا۔لہٰذا الٰہ آباد سے آنے والے تینوں حضرات نے وزیر منزل میں ڈیرہ ڈالا اور اسی کے ایک حصے کو انجمن کے دفتر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا، محمود الظفر کانفرنس کے جنرل منیجر بنا دیئے گئے اور انہوں نے کانفرنس

کے کاغذات خطوط اور دستاویز تیار کرنے کا کام سنبھال لیا۔ اس کے بعد کانفرنس کے لئے ہال کی تلاش شروع ہوئی۔ لکھنؤ میں تین چار ہال ایسے تھے جہاں کانفرنس منعقد ہوسکتی تھی لیکن ان دنوں کوئی بھی ہال مختلف وجوہات کے سبب دستیاب نہ تھا۔ تاہم رفاہ عامہ ہال حاصل کرنے کے لئے کوششیں شروع کردی گئیں۔ پنڈت آنند نرائن ملا جو کہ ترقی پسند نظریات سے کس قدر اختلاف رکھتے تھے لیکن اچھے شاعر اور ادب نواز انسان تھے، ان کی اور بعض دوسرے لوگوں کی کوششوں سے رفاہ عامہ ہال مفت مل گیا، اس کے بعد استقبالیہ کمیٹی ترتیب دی گئی۔ جس میں رشیدہ جہاں اور ہاجرہ مسرور بھی شامل تھیں، جنہوں نے کانفرنس کے دن ہال کے دروازے پر مندوبین اور دیگر شرکاء کا استقبال کیا اور فنڈ اکٹھا کرنے کی غرض سے شرکاء میں کانفرنس کے ٹکٹ فروخت کئے۔ کانفرنس میں بنگال سے دو، پنجاب سے تین، مدراس سے ایک، گجرات سے دو، مہاراشٹر سے چھ اور یوپی سے پچیس ادیب شامل ہوئے، کانفرنس کے باقی شرکاء مقامی لوگ تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کا صدر چوہدری محمد علی ردولوی کو بنایا گیا۔ دس اپریل کو صبح ساڑھے نو بجے رفاہ عامہ ہال میں کانفرنس شروع ہوئی۔ استقبالیہ خطبہ چوہدری محمد علی ردولوی نے پڑھا، اس کے بعد منشی پریم چند کو کانفرنس کا صدر منتخب کیا گیا۔ خطبہ استقبالیہ کے بعد منشی پریم چند نے افتتاحی خطبہ صدارت پڑھا۔ جو سترہ صفحات پر مشتمل تھا۔ منشی پریم چند کا خطبہ اعلیٰ درجے کی ادبی تحریر اور مقصدیت سے بھرپور تھا۔ وہ اپنے خطبے میں ادب کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''جس ادب سے ہمارا ذوق صحیح بیدار نہ ہو، روحانی اور ذہنی تسکین نہ ملے ہم میں قوت اور حرارت نہ پیدا ہو۔ ہمارا جذبہ حسن نہ جاگے، جو ہم میں سچا ارادہ اور مشکلات پر فتح پانے کے لئے سچا استقلال نہ پیدا کرے وہ آج ہمارے لئے بیکار ہے اس پر ادب کا اطلاق نہیں ہوسکتا۔''(۸)

کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے حوالے سے تبصرہ کرتے ہوئے منشی پریم چند کہتے ہیں:

> ''ہماری انجمن نے کچھ اسی طرح کے اصولوں کے ساتھ میدانِ عمل میں قدم رکھا ہے۔ وہ ادب کو خمریات اور شبابیات کے دستِ نگر نہیں دیکھنا چاہتی۔ وہ ادب کو سعی اور عمل کا پیغام اور ترانہ بنانے کی مدعی ہے اور اسے زبان سے بحث نہیں۔ آئیڈیل کے وسعت کے ساتھ زبان خود بخود سلیس ہوجاتی ہے۔ حسن معنی آرائش سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔ جو ادیب امراء کا ہے وہ امراء کا طرز بیان اختیار کرتا ہے۔ جو عوام الناس کا ہے وہ عوام کی زبان لکھتا ہے۔ ہمارا مدعا ملک میں ایسی فضا پیدا کرنا ہے جس میں مطلوبہ ادب پیدا ہوسکے اور نشوونما پاسکے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ادب کے مرکزوں میں ہماری انجمنیں قائم ہوں اور وہاں ادب کے تعمیری رجحانات پر باقاعدہ چرچے ہوں۔ مضامین پڑھے جائیں، مباحثے ہوں، تنقیدیں ہوں، جبھی وہ فضا تیار ہوگی جبھی ادب کے نشاۃ ثانیہ کا ظہور ہوگا، ہم ہر اک زبان میں ایسی انجمنیں کھولنا چاہتے ہیں تاکہ اپنا پیغام ہر اک زبان میں پہنچائیں۔ یہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ یہ ہماری ایجاد ہے۔ ملک میں اجتماعی جذبات ادیبوں کے دلوں میں موجزن ہیں۔ ہندوستان کی ہر اک زبان میں اس خیال کی تخم ریزی فطرت نے اور حالات نے پہلے ہی سے کر رکھی ہے اس کے انکھوے بھی نکلنے لگے ہیں۔ اس کی آبیاری کرنا اس کے

آئیڈیل کو تقویت پہنچانا ہمارا مدعا ہے۔ ہم ادیبوں میں قوت عمل کا فقدان ہے، یہ ایک تلخ حقیقت ہے مگر ہم اس کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے، ابھی تک ہم نے ادب کا جو معیار اپنے سامنے رکھا تھا اس کے لئے عمل کی ضرورت نہ تھی، فقدان عمل ہی اس کا جوہر تھا۔ کیونکہ بسا اوقات عمل اپنے ساتھ تنگ نظری اور تعصب بھی لاتا ہے، اگر کوئی شخص پارسا ہو کر اپنی پارسائی، پر غرّا کرے۔ اس سے کہیں اچھا ہے کہ وہ پارسا نہ ہو، رند ہو۔''(۹)

اس پہلی کل ہند کانفرنس میں سجاد ظہیر کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا جنرل سیکرٹری چُنا گیا۔ انجمن کی دستور ساز کمیٹی جو ڈاکٹر عبدالعلیم، محمود الظفر اور سجاد ظہیر پر مشتمل تھی نے کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کے دستور کا مسودہ پیش کیا۔ جو اتفاق رائے سے منظور ہوا۔ کانفرنس کے آخری اجلاس میں جے پرکاش نرائن، یوسف میر علی، اندولال یاچنک، کملا دیوی، چٹ پادیہ اور میاں افتخار الدین نے بھی شرکت کی۔ فیض احمد فیض پوری کانفرنس میں متحرک رہے کانفرنس میں بُلبل ہند سروجنی نائڈو کا پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا اور اختتامی سیشن میں ایک اعلان نامہ جاری کیا گیا۔ جو درج ذیل ہے۔

''ہمارے ملک میں بڑی بڑی تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ پستی اور رجعت پسندی کو اگرچہ موت کا پروانہ مل چکا ہے لیکن وہ ابھی تک بے بس اور معدوم نہیں ہوئی ہے۔ نت نئے روپ بدل کر یہ مہلک زہر ہمارے تمدن کے ہر شعبہ میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ اس لئے ہندوستانی مصنفوں کا فرض ہے کہ جو نئے ترقی پذیر رجحانات اُبھر رہے ہیں۔ ان کی ترجمانی کریں اور ان کی نشوونما میں پورا حصہ لیں۔ ہندوستانی ادب کی نمایاں خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ زندگی کی بیّن اور حقیقی کیفیتوں سے جی چرانا چاہتا ہے حقیقت اور اصلیت سے بھاگ کر ہمارے ادب نے بے بنیاد روحانیت اور تصویر پرستی کی آڑ میں پناہ لی ہے یہی وجہ ہے کہ اس کے عناصر قوے مضمحل ہو گئے ہیں اس کا پتہ اس سے چلتا ہے کہ ہمارے ادب میں عقلیت مشکل سے پائی جاتی ہے۔ ہماری انجمن کا مقصد یہ ہے کہ ادبیات اور فنون لطیفہ کو قدامت پرستوں کی مہلک گرفت سے نجات دلائے اور ان کو عوام کے سکھ دکھ اور جدوجہد کا ترجمان بنا کر اس روشن مستقبل کی راہ دکھائے جس کے لئے انسانیت اس دور میں کوشاں ہے۔''(۱۰)

ہم ہندوستانی تمدن کی اعلیٰ ترین روایتوں کے وارث ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس لئے زندگی کے جس شعبے میں ردّعمل کے آثار پائیں گے انہیں اختیار کریں گے، ہم اس انجمن کے ذریعہ سے ہر ایسے جذبہ کی ترجمانی کریں گے جو ہمارے وطن کو ایک نئی اور بہتر زندگی کی راہ دکھائے۔ اس کام میں اپنے اور غیر ملکوں کے تہذیب وتمدن سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو اپنا موضوع بنائے۔ یہ بھوک، افلاس، سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری پستی اور توہم پرستی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ ہم ان تمام باتوں کو جو ہماری قوت تنقید کو اُبھارتی ہیں اور رسموں اور اداروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھتی ہیں۔ تغیر اور ترقی کا ذریعہ سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ انجمن کے مقاصد یہ ہوں گے(۱۱):

۱۔ تمام ہندوستان کے ترقی پسند مصنفین کی امداد سے مشاورتی جلسے منعقد کر کے اور لٹریچر شائع کر کے اپنے مقاصد کی تبلیغ کرنا۔

۲۔ ترقی پسند مضامین لکھنے اور ترجمہ کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

۳۔ ترقی پسند مصنفین کی مدد کرنا۔

۴۔ آزادی رائے اور آزادی خیال کی حفاظت کی کوشش کرنا۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل ہند کانفرنس دسمبر ۱۹۳۸ء میں کلکتہ کے ایک سکول کے ہال میں منعقد ہوئی۔اس کانفرنس میں تقریباً ایک ہزار آدمیوں نے شرکت کی۔کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کے صدر سندھیل اناتھ دت تھے جبکہ کانفرنس کی صدارتی مجلس میں ڈاکٹر جے این سین گپتا بھی شامل تھے۔اس کانفرنس کا افتتاح رابندر ناتھ ٹیگور نے کرنا تھا۔لیکن بیماری کی وجہ سے وہ تشریف نہ لا سکے اور انہوں نے اپنا خطبہ لکھ کر بھیج دیا جو کانفرنس میں پڑھا گیا۔اس خطبے کے اختتامی جملے یہ تھے:

> ''یاد رکھو تخلیق ادب بڑے جوکھوں کا کام ہے۔حق اور جمال کی تلاش کرنا ہے تو پہلے ان کی کینچلی اُتار دو،کلی کی طرح سخت ڈنٹھل سے نکلنے کی منزل طے کرو۔پھر دیکھو کہ ہوا کتنی صاف ہے،روشنی کتنی سہانی ہے اور پانی کتنا لطیف ہے۔''(۱۲)

کلکتہ کانفرنس میں انجمن کے آئین میں چند تبدیلیاں بھی کی گئیں اور انجمن ترقی پسند مصنفین کا کل ہند نیا جنرل سیکرٹری ڈاکٹر علیم کو چنا گیا۔اس کانفرنس میں ملک راج آنند جو برطانیہ سے واپس آ چکے تھے نے بھی شرکت کی۔کرشن چندر نے بطور سیکرٹری انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب شرکت کی۔لکھنؤ سے ڈاکٹر عبدالعلیم مجاز، پروفیسر احمد علی، سجاد ظہیر، علی سردار جعفری اور رضیہ سردار جعفری نے بطور مندوب شرکت کی۔انجمن کی تیسری کل ہند کانفرنس دہلی میں اپریل ۱۹۴۲ء میں منعقد ہوئی جس میں سجاد ظہیر دوبارہ کل ہند سیکرٹری جنرل چنے گئے۔

تیسری کانفرنس کی خاص بات یہ تھی کہ اس میں ترقی پسند ادیبوں کے ساتھ ساتھ بہت سی دیگر ادبی شخصیات نے شرکت کی۔جن میں مولانا صلاح الدین، ن م راشد، عبدالمجید سالک اور حفیظ جالندھری نمایاں شخصیات تھیں۔

۱۹۴۲ء میں ہی انجمن کی چوتھی کل ہند کانفرنس بمبئی میں منعقد ہوئی جس کے صدارتی پینل میں جوش ملیح آبادی، راہل سنکرنائن، سین حزمدار، اے ایس ڈانگے، سجاد ظہیر شامل تھے۔اس کانفرنس میں خواجہ احمد عباس کو انجمن کا جوائنٹ سیکرٹری منتخب کیا گیا۔

۴۴-۱۹۴۳ء میں ترقی پسند ادیبوں کی حیثیت سے جو نام سامنے آئے ان میں احمد ندیم قاسمی، ساحر لدھیانوی، ظہیر کاشمیری، عبداللہ ملک، کیفی اعظمی، ڈاکٹر عبادت بریلوی، وامق جونپوری، ممتاز حسین، ابراہیم جلیس، سلیمان اریب، شاہد صدیقی، ہنس راج رہبر، پرویز شاہدی، احتشام حسین اور خواجہ احمد عباس شامل ہیں۔بمبئی کے اجلاسوں میں پرتھوی راج، سہراب مودی، ڈبلیو زیڈ احمد، جگر مرادآبادی، سبھدرا کماری چوہان، اودھے شنکر، انگریزی ناولسٹ ای۔ایم فاسٹر، مولوی عبدالحق کے لئے خصوصی اجلاس منعقد کئے گئے۔ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور جب بمبئی منتقل ہو گئیں تو وہ انجمن کے

اجلاسوں سے وابستہ ہوگئیں۔ بمبئی کے اجلاسوں میں سب سے جاندار تنقید کرنے والے ڈاکٹر ظ۔انصاری ہوتے تھے۔ اسی طرح حیدرآباد میں پروفیسر عزیز احمد ترقی پسند تحریک کو بڑھاوا دے رہے تھے اور انہوں نے ترقی پسند تنقید کی پہلی کتاب ''ترقی پسند ادب'' کے عنوان سے تحریر کی۔

قیام پاکستان کے بعد انجمن ترقی پسند مصنفین (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۴ء):

قیام پاکستان کے بعد لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے ہفتہ وار اجلاس ہونا شروع ہو گئے تھے اور لاہور کی انجمن کا جنرل سیکرٹری بمبئی کے سابق جنرل سیکرٹری حمید اختر کو بنایا گیا، جبکہ جوائنٹ سیکرٹری راحت امین چغتائی مقرر کئے گئے۔ لاہور انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس ملتان روڈ پر رفیع پیرزادہ کی بیٹھک میں ہوتے تھے۔ بعد ازاں اجلاسوں کا مقام بدل کر طاہرہ مظہر علی کے گھر واقع نکلسن روڈ پر منتقل ہو گیا۔ کچھ عرصہ بعد حمید اختر کی جگہ ہاجرہ مسرور کو انجمن ترقی پسند مصنفین کی لاہور کی جنرل سیکرٹری منتخب کر لیا گیا۔ انجمن کی پالیسیاں اور حکمت عملی طے کرنے کے لئے ایک خصوصی کمیٹی بھی ترتیب دی گئی۔ جس میں محمد صفدر میر، ظہیر کاشمری، راحت امین چغتائی شامل تھے۔ جبکہ عبداللہ ملک کو انجمن ترقی پسند مصنفین پنجاب کا آرگنائزنگ سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ پنجاب کے علاوہ دیگر اہم شہروں میں بھی انجمن کی مقامی سرگرمیاں شروع کر دی گئیں تھیں۔ پشاور میں اجمل خٹک، خاطر غزنوی اور فارغ بخاری سرگرم تھے جبکہ کراچی میں حسن عابدی، سوبھوگیان چندانی اور دیگر ترقی پسند ادیبوں نے تنقیدی اجلاس منعقد کروانا شروع کر دیئے تھے اور کوئٹہ میں عبداللہ جان جمالدینی، میر گل خاں، نصیر اور ان کے دیگر ساتھی انجمن کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے تھے۔ سبط حسن ان دنوں انجمن سے زیادہ کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان میں مصروف عمل ہو چکے تھے۔ صفدر میر، مظہر کاشمیری، عبداللہ ملک، ہاجرہ مسرور، احمد راہی، فیض احمد فیض لاہور کے ادبی پرچوں اور صحافت سے منسلک ہونے کے ساتھ ساتھ انجمن کی سرگرمیوں میں بھی پوری طرح متحرک تھے۔ (۱۲)

سجاد ظہیر کے بھارت سے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں موجود ترقی پسند لکھاریوں کے درمیان روابط کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوا اور لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان پہلی کانفرنس کا انعقاد ہونا طے پایا۔ یوں گیارہ، بارہ اور تیرہ نومبر ۱۹۴۹ء کو اوپن ایئر تھیٹر باغ جناح لاہور میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کل پاکستان پہلی کانفرنس منعقد ہوئی جس کی صدارت مولانا چراغ حسن حسرت نے کی۔ انہوں نے صدارتی خطبہ دیتے ہوئے کہا:

> ''رفقائے کرام! اگر آپ شعر و ادب کے جمال صداقت کے شیدائی ہیں تو آپ کو بہت سی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ آپ کے نغموں میں زیادہ بلند آہنگی اور سرمستی پیدا ہو جائے تا کہ کارواں زیادہ تیزی سے سفر کر سکے ایرانی شاعر نے اسی لئے تو کہا ہے۔
>
> نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کمیابی
> خدی را تیز ترمی خواں چو محمل راگراں بینی
>
> ''حضرات! آپ کو نکتہ چینوں اور معترضوں سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ فرانس کے ایک ادیب نے کہا ہے کہ جب ایسے لوگ جن کی رجعت پسندی مسلم ہے کسی چیز کی مخالفت کریں تو یقین کر لو کہ اس

چیز میں ضرور کوئی نہ کوئی خوبی موجود ہے اس لئے مخالفوں کی نکتہ چینی اور خوردہ گیری سے ڈرنے کے بجائے اسے اپنی سب سے بڑی کامیابی سمجھنا چاہیے۔''(۱۳)

اس کانفرنس میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے نئے منشور کی منظوری دی گئی جس میں کہا گیا:

''ہم اپنے نصب العین پر بے باکی سے قائم رہیں گے اور ترقی پسند ادب کے دشمنوں سے کوئی سمجھوتہ نہیں کریں گے اور نہ ان کے ساتھ کوئی اشتراک عمل کریں گے تذبذب اور سمجھوتہ بازی سے ہماری ادبی تحریک کو سخت نقصان پہنچے گا۔''(۱۴)

کانفرنس میں احمد ندیم قاسمی کو انجمن ترقی پسند مصنفین کا مرکزی جنرل سیکرٹری منتخب کیا گیا۔ کانفرنس میں پورے پاکستان سے سو سے زیادہ مندوبین نے شرکت کی۔ سندھ کے فنکاروں نے سندھی زبان میں عوامی تھیٹر پیش کیا۔ سرحد سے آئے ہوئے نوجوانوں نے خٹک ڈانس کا مظاہرہ کیا۔ کانفرنس میں آنے والے بیشتر ادیبوں کا تعلق کراچی، کوئٹہ، پشاور، لاہور، میانوالی، لائلپور (فیصل آباد) سیالکوٹ، ملتان، راولپنڈی، اوکاڑہ، گجرات، گوجرانوالہ اور حیدر آباد سے تھا۔ اس کے علاوہ بھی دیگر بہت ساری جگہوں سے انفرادی حیثیت میں ادیب اس کانفرنس میں شریک ہوئے۔ کانفرنس کی ایک کامیابی یہ بھی تھی کہ ہزاروں مزدوروں کسانوں نے اس میں شرکت کی اور اوپن ایئر تھیٹر میں تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ حالانکہ دائیں بازو اور سرکار کی سرپرستی میں پھلنے پھولنے والے ادیبوں، شاعروں نے کانفرنس کو ناکام بنانے کے لئے مختلف قسم کی افواہیں پھیلا رکھی تھیں اور یہ افواہ عام تھی کہ کانفرنس میں گولی چلے گی لیکن اس کے باوجود کانفرنس ہر حوالے سے کامیاب رہی۔ کانفرنس کے پنڈال پر دائیں بازو کے بہت سے دانشوروں جن میں ظہور الحسن ڈار، سیف الدین سیف، وحید قریشی اور چٹان پریس کے لٹھ بردار ورکروں نے اپنے سرغنہ شورش کاشمیری کی قیادت میں حملہ کیا۔ لیکن انہیں حاضرین نے مار بھگایا اور کانفرنس اپنے شیڈول کے مطابق جاری رہی۔ اس کانفرنس میں روسی اور امریکی ادیبوں کے علاوہ جان نثار اختر، احتشام حسین، کیفی اعظمی اور دوسرے بہت سے ترقی پسند ادیبوں کے پیغامات بھی پڑھ کر سنائے گئے۔ اس کانفرنس میں بہت سی قراردادیں بھی منظور کی گئیں ان میں سے ایک قرارداد کے ذریعے ن م راشد، میراجی، سعادت حسن منٹو اور عصمت چغتائی کے نراجیت پسند ادیب ہونے کے سبب ان کے بائیکاٹ کا بھی اعلان کیا گیا، جس پر پورے ملک میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے انجمن کے خلاف روزنامہ نوائے وقت لاہور میں بہت سے مضامین لکھے۔ اسی طرح ادب لطیف میں کانفرنس کے حوالے سے ایک منفی نوعیت کا اداریہ لکھا۔ جس کا جواب احمد ندیم قاسمی نے اپنے ایک مضمون 'سویرا بنام ادب لطیف' کے عنوان سے لکھ کر دیا۔(۱۵)

اس کانفرنس میں اگرچہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنے ۱۹۳۶ء کے موقف پر قائم رہتے ہوئے اپنا منشور منظور کیا تھا۔ لیکن قراردادوں کے ذریعے انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا گیا۔ اس ساری صورت حال کے باوجود انجمن ترقی پسند مصنفین پورے ملک میں پھیل گئی اور تمام بڑے شہروں میں اس کے تنظیمی یونٹ قائم ہو گئے ملک کے نئے لکھنے والوں کی اکثریت انجمن ترقی پسند مصنفین کی صفوں میں شامل ہو گئی اور ان کے ادب میں ترقی پسند ادب کی واضح جھلک نظر آنے لگی جو کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بڑی کامیابی تھی۔

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس:

انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری کل پاکستان کانفرنس ۱۲، ۱۳ جولائی ۱۹۵۲ء کو کراچی میں منعقد ہوئی اس کانفرنس کی صدارت مولوی عبدالحق صدر انجمن ترقی اُردو پاکستان نے کی۔ انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

> ''غلطی کو کبھی اہمیت نہیں دینا چاہیے۔ یہ بہت معمولی چیز ہے۔ سب غلطیاں کرتے ہیں بڑے بڑوں نے غلطیاں کیں ہیں۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بھی غلطیاں کیں مگر انہوں نے کام بھی کیا اور قابل قدر کام ہے میں ان کی تعریف سے زیادہ اس بات کی کرتا ہوں کہ ان میں اتنی جرات ہے کہ جب انہیں اپنی غلطی معلوم ہوئی تو اس کا اعتراف کیا اور اس میں تبدیلی کی جیسا کہ آپ ان کے منشور سے معلوم کر چکے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ یہ جو آپ نے سُنا ہے اگلے سال اس میں تھوڑی سی ترمیم کی ضرورت ہے۔ اس میں ذرا تلخی کو کم کرنا چاہیے سچائی مقدم اور ضروری ہے لیکن تلخی سے بدذوقی پیدا ہوتی ہے۔''(۱۶)

انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سیکرٹری احمد ندیم قاسمی نے اپنی رپورٹ پیش کی۔ جس میں انہوں نے ان کوتاہیوں اور غلطیوں کی نشاندہی کی جو انجمن سے گذشتہ کانفرنس میں سرزد ہوئیں تھیں لہٰذا ایک قرارداد کے ذریعے ۱۹۴۹ء میں بعض ادیبوں اور رسائل کا بائیکاٹ کرنے والی قرارداد کو منسوخ کرنے کے لئے ایک نئی قرارداد منظور کی گئی اور تمام ادیبوں کے لئے انجمن کے دروازے کھول دیئے گئے جس کے بعد ازاں انتہائی مثبت اثرات مرتب ہوئے۔ کانفرنس میں ۱۹۴۹ء کے منشور کی تنسیخ کر کے ۴۹ نکات پر مشتمل نیا منشور پاس کیا گیا جس کا ایک اہم حصہ درج ذیل تھا:

> ''ترقی پسند ادب کی تحریک نے ہمارے سماجی شعور کے ارتقا اور معاشرتی تقاضوں کا بھرپور اظہار کیا ہے اور ادب میں سائنٹیفک نقطہ نظر جمہوری اقدار اور انسان دوستی کو فروغ دیا ہے۔ یہ ترقی پسند ادب ہی کا کارنامہ ہے کہ ہمارے ادب میں قنوطیت، انفعالیت، قدامت پرستی، مقدر پرستی اور زندگی کو فریبِ محض سمجھنے کے تصورات کمزور پڑ گئے ہیں اور اسی طرح تحریک نے ادب اور زندگی کے رشتہ کو تصوری طور پر واضح کیا ہے۔
>
> ہم اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہیں کہ آج بھی ہمارے ملک میں دو قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں جو ہماری ادبی ترقی کی راہ میں حائل ہیں۔ ایک تو وہ رجحانات ہیں جو پرانے نظام معیشت کی پسماندگی کا نتیجہ ہیں دوسرے وہ رجحانات ہیں جو مغربی استعمار کے آوردہ اور پروردہ ہیں مثلاً ہیئت پرستی، سُریت، حیوانیت، فحش نگاری، جنسی انتشار پسندی، ابہام پسندی اور رہبانیت۔
>
> آج اگر ہمارے ملک کے باشعور ادیبوں نے ان خطرناک رجحانات کو بے نقاب نہ کیا اور زندگی کی توانا قدروں کو آگے نہ بڑھایا تو ہمارا ادب بے جان ہو کر رہ جائے گا۔
>
> انجمن ترقی پسند مصنفین ایک ادبی جماعت ہے اور اس کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہیں ہے ترقی پسند ادیب اب ادب کو زندگی کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہیں اور اس بات کے مدعی ہیں کہ

اختلافی ادبی مسائل کو بحث واستدلال کے ذریعے طے کیا جائے۔
ہماری انجمن صحت مند ادب کی تخلیق کے لئے ملک میں جمہوریت کی نشوونما، خوش حالی، صنعتی ترقی، عام تعلیم اور سائنس کی تعلیم کو ضروری سمجھتی ہے اور اس امر پر یقین رکھتی ہے کہ ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک عالمگیر پُر امن فضا کی ضرورت ہے۔
ترقی پسند ادب کی تحریک اپنے ادبِ عالیہ کی صحت مند روایات کی حامل ہے اور انہیں زندگی کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کرتی ہے۔ ہم اپنے ماضی کے تمام ثقافتی اور ادبی ورثہ کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کے بجائے تنقید اور تحقیق کی روشنی میں پرکھتے ہیں۔
ہم ادب میں تجربہءِ محض کے قائل نہیں لیکن ہم اس نئے ادبی تجربے کا خیر مقدم کرتے ہیں جو ہماری ادبی روایت اور زندگی کے لئے مطالبات سے ہم آہنگ ہو اور جس سے ہمارے ادب میں حسن کی پُر مائیگی اور گہرائی کا اضافہ ہو۔''(۱۷)

اس کانفرنس کے تین اہم اجلاسوں میں سے ابتدائی اجلاس کی صدارت جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے مولوی عبدالحق نے کی۔ ۱۳ جولائی کے دوسرے اجلاس کی صدارت مولانا عبدالمجید سالک نے کی انہوں نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا:

''انجمن ترقی پسند مصنفین پر روز اوّل سے کمیونزم کی چھاپ لگی ہوئی تھی چنانچہ بعض حلقے اس کا نام سن کر ناک بھوں چڑھاتے تھے میں اکثر ان لوگوں سے بحث کر کے یہ بتاتا کہ نہ ترقی پسندی پر صرف کمیونسٹوں کا اجارہ ہے اور نہ انجمن ترقی پسند مصنفین کمیونسٹ ادارہ ہے۔ بلکہ ہر وہ شخص جو ادب میں ایک مسلک کو تسلیم کرتا ہے اور جہالت اور اوہام پرستی اور ملوکیت اور سرمایہ داری کو عالم انسانی کے لئے مُضر رساں سمجھتا ہے وہ اس انجمن کا ممبر بن سکتا ہے..... مجھے بے انتہا مسّرت ہے کہ ترقی پسند مصنفین آج ایک نیا منشور منظر عام پر لائے ہیں جس کو پڑھ کر تمام غلط فہمیاں اور بدگمانیاں دور ہو جائیں گی۔ کیونکہ منشور کے مطابق یہ خالص ادیبوں کی انجمن ہے ان تمام ادیبوں کی جو ادب کو زندگی کا ترجمان اور معمار سمجھتے ہیں۔''(۱۸)

کانفرنس کا آخری اجلاس مشاعرے کی صورت میں تھا جس کی صدارت پیر حسام الدین راشدی نے کی اس کانفرنس میں جن اہم ادیبوں نے شرکت کی ان میں ممتاز حسین، حمید اختر، مجتبیٰ حسین، حسن منظر، سلیم احمد، حسن اختر، احمد ندیم قاسمی، احمد راہی، ظہور نظر، نظر حیدر آبادی، قمر اجنالوی، حسن طاہر، تیغ الہٰ آبادی، مجید لاہوری، رئیس امروہی، عارف جلالی، حبیب جالب، صبا لکھنوی اور شاعر لکھنوی شامل تھے۔

۱۹۵۲ء کے بعد پاکستان کے سیاسی، سماجی حالات تبدیل ہونا شروع ہو چکے تھے پاکستان کی ریاست، حکومت اور حکمران طبقوں کا جھکاؤ امریکی لابی کی طرف بڑھتا جارہا تھا اور پاکستانی حکومت امریکی دفاعی اور معاشی معاہدوں میں الجھتی چلی جارہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف ملک میں ترقی پسند سیاسی تحریکیں ملک کے عوام میں ہر آنے والے دن پہلے سے

زیادہ مقبول ہوتی جارہی تھیں۔ادب کے میدان میں ترقی پسند ادیب بڑی شدّ ومد سے انجمن ترقی پسند مصنفین کے پلیٹ فارم سے سماجی حقیقت نگاری کے اسلوب میں عوام کے دکھ درد پر مبنی اعلیٰ پائے کا ادب وافر مقدار میں تخلیق کررہے تھے۔ جس سے بالادست طبقے ناخوش تھے اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی ترقی پسند ادب کی تحریک کو فکری سطح پر اپنے لئے ایک بڑا خطرہ سمجھنے لگے تھے۔لہٰذا انہوں نے ترقی پسند ادبی تحریک کا قلع قمع کرنے کے لئے سیفٹی ایکٹ کا استعمال کرتے ہوئے انجمن ترقی پسند مصنفین کو ایک سیاسی تنظیم قرار دیتے ہوئے اس پر پابندی لگادی اور اس سے منسلک بے شمار معتبر ادیبوں اور شاعروں کو گرفتار کر کے ملک کی مختلف جیلوں میں ڈال دیا گیا۔گرفتار کئے جانے والوں میں احمد ندیم قاسمی، سجاد ظہیر، فیض احمد فیض، سبط حسن، حسن عابدی، حمید اختر، ظہیر کاشمیری، صفدر میر اور عبداللہ ملک سمیت درجنوں دیگر لکھاری شامل تھے۔ انجمن پر پابندی لگانے کا اعلان تو کیا گیا لیکن اس سے متعلقہ تمام دستاویزات کو حکومتی سطح پر خفیہ رکھا گیا جو ابھی تک منظر عام پر نہیں آئیں ہیں۔

۲۵ جولائی ۱۹۵۴ء کی پابندی کے نتیجے میں بظاہر تنظیم کا ڈھانچہ ختم ہوگیا لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک ختم نہ ہوسکی۔اس طرح ترقی پسند ادب کی تحریک کا سفر جاری وساری رہا، کچھ وقت گزرنے کے بعد ملک کے مختلف حصوں میں مختلف ناموں سے نئی ادبی تنظیمیں بن گئیں جن کا منشور انہی نکات پر مشتمل تھا جو انجمن ترقی پسند مصنفین کے منشور میں شامل تھے۔اس سلسلے کی پہلی تنظیم کراچی میں عوامی ادبی انجمن کے نام سے قائم ہوئی۔اندرون سندھ، سندھی لکھاریوں نے سندھی ادبی سنگت قائم کی۔خیبر پختون خواہ میں جرگہ کے نام سے ترقی پسند لکھاریوں کی نئی تنظیم اُبھر کر سامنے آئی اور بلوچستان میں بلوچی ادبی سنگیت کی بنیاد رکھی گئی۔جبکہ پنجاب میں صفدر میر نے بہت سے لکھاریوں کے ساتھ مل کر پنجابی ادبی سنگت کی بنیاد رکھی۔یوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے تنظیمی ڈھانچے کا ایک عہد سرکاری جبر کے نتیجے میں اپنے اختتام کو پہنچا لیکن ترقی پسند ادب کی تحریک وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے سبب اپنے روپ بدل بدل کر اپنے سفر پر رواں دواں رہی۔

برصغیر میں ادب کے ترقی پسند مکتبہءِ فکر کی تاریخ جانچنے کے بعد یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد ٹھہرے پانی میں پہلا پتھر سرسید احمد خاں نے پھینکا اور انہوں نے ادب میں نہ صرف مقصدیت کے پہلو کو اُجاگر کیا بلکہ بدلتے ہوئے سماجی، سیاسی اور معاشی حالات کے مطابق رسم ورواج طرزِ فکر اور جدید علوم کو اپنانے کی قوم کو راہ دکھائی۔ انہوں نے علم وادب کو دربار اور خانقاہوں کے اثر سے آزاد کراتے ہوئے سائنٹیفک بنیادوں پر ہر چیز کا جائزہ لینے کی طرح ڈالی۔لیکن سرسید یہ سب کچھ برطانوی حکومت کی چھتر چھاؤں تلے رہ کر کر رہے تھے اور بعض معاملات میں ان کا رویہ معذرت خواہانہ تھا۔

سرسید کے نقطہ نظر کو ہی آگے بڑھاتے ہوئے الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے ادب میں ترقی پسندی کا رجحان مزید تیز تر کرنے کے لئے انجمن پنجاب کے نام سے ادبی تنظیم قائم کی۔اور نظم معرّا اور نظم آزاد کی طرح ڈالی۔جس کے لئے انہوں نے نظم کے مشاعرے منعقد کروائے۔مولانا الطاف حسین حالی نے مقدمہ شعر وشاعری اور یادگار غالب تحریر کر کے آزادانہ اور مقصدیت پر مبنی تنقید کا سکول قائم کیا۔حالی سے پہلے برصغیر کے ادب میں تنقید کا کوئی مکتبہ فکر نہ تھا۔اور نہ ہی تنقید کی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی صرف تذکرے لکھے جاتے تھے جو صرف تعریف وتوصیف پر مبنی

ہوتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے آبِ حیات لکھ کر الطاف حسین حالی کے نقطہ نظر کو مزید تقویت بخشی۔ مولانا محمد حسین آزاد نے برطانوی حکومت کے لئے چند ایسے فریضے بھی سرانجام دیئے جو برصغیر کے آزادی پسند اور خالصتاً مشرقی فکر کے پابند دانشوروں اور ادیبوں کو قبول نہ تھے، لیکن اس کے باوجود سرسید، الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد، آزادی کی سیاسی تحریکوں سے دور رہنے کے باوجود فنون و ادب میں ارتقا کے عمل کو آگے بڑھانے میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ادب و فن کے مذکورہ بالا مشاہرین کی گرانقدر خدمات کے باوجود برصغیر کے ادب میں چند چیزوں کی کمی تھی۔ ایک تو اس میں حریت فکر کا پہلو عنقا تھا۔ دوسرا برصغیر کے نوآبادی ہونے کے سبب ادب میں آزادی کی خواہش اور جدوجہد کے حوالے سے جس قسم کے مواد کو پیش کرنے کی ضرورت تھی وہ پیش نہیں کیا جا رہا تھا۔ برصغیر کا ادب فکری سطح پر بین الاقوامی تحریک سے الگ تھلگ تھا اور ترقی یافتہ اقوام کے ہاں صنعت کے فروغ کے سبب منڈیوں کے لئے جو لڑائیاں ہو رہی تھیں اور اس کے نتیجے میں جرمنی اور اٹلی میں فاشزم کی جو مضبوط لہر اٹھی تھی، برصغیر کا ادب اس سے متعلقہ موضوعات سے خالی تھا۔ دنیا میں سرمایہ داری کی دن بدن بڑھتی ہوئی یلغار نے نوآبادیات کی معاشرت اور معیشت پر جو گہرے منفی اثرات مرتب کئے تھے برصغیر کے ادیب شاعر اور دانشور اس طرف بالکل توجہ نہیں دے رہے تھے۔

۱۹۳۶ء سے قبل کچھ ادیبوں نے انفرادی سطح پر مذکورہ بالا نکات کو اپنی تخلیقات اور تحریروں میں جگہ دینی شروع کر دی تھی لیکن یہ پورے برصغیر میں ایک طاقتور لہر نہیں بنی تھی۔ ۱۹۳۶ء میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام سے مذکورہ پہلو ادب پر وا ہونا شروع ہو گئے اور ترقی پسندی کی تحریک مضبوط سے مضبوط تر ہونے لگی۔ ۱۹۴۰ء تک یہ تحریک پورے برصغیر میں مکمل طور پر جڑ پکڑ چکی تھی اور ادب میں ترقی پسندی کا پوری طرح غلبہ ہو چکا تھا۔ جس کے نتیجے میں افسانہ، ناول، نظم اور تنقید کے میدان میں نئے عہد کا جاندار ترقی پسند ادب پیدا ہوا۔

حوالہ جات

۱۔ رشید مصباح، انجمن ترقی پسند مصنفین کا پچھتر سالہ سفر، مشمولہ: ماہنامہ سرخ چنار (لاہور: فروری مارچ ۲۰۱۲ء)، ص ۷۔۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۰ ۳۔ ایضاً، ص ۱۱

۴۔ سجاد ظہیر، روشنائی، (کراچی: مکتبہ دانیال، جنوری ۱۹۸۱ء)، ص ۸۸

۵۔ ایضاً، ص ۸۹۔۹۰ ۶۔ ایضاً، ص ۹۷

۷۔ ایضاً، ص ۹۶ ۸۔ ایضاً، ص ۱۱۲

۹۔ منشی پریم چند، ادب کی غرض و غایت، مشمولہ: ماہنامہ سرخ چنار، (لاہور: شمارہ فروری، مارچ ۲۰۱۲ء)، ص ۷۰۔۷۱

۱۰۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا اعلان نامہ، مشمولہ: ماہنامہ سرخ چنار، ص ۱۱۶۔۱۱۷

۱۱۔ رشید مصباح، انجمن ترقی پسند مصنفین کا پچھتر سالہ سفر، مشمولہ: سرخ چنار، ص ۱۷

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۴

۱۳۔ جمال نقوی، ترقی پسند تحریک کا سفر، (کراچی: انور ذکی پرنٹرز، ۲۰۱۱ء)، ص ۴۲

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۳

۱۵۔ حمیرا اشفاق، فکری و نظری مباحث، (لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء)، ص ۳۴۹

۱۶۔ جمال نقوی، ترقی پسند تحریک کا سفر، ص ۴۴

۱۷۔ ایضاً، ص ۴۵۔۴۶

۱۸۔ ایضاً، ص ۷